اسلام اور آزادئ و جمہوریت-۲

برنارڈ لیوس

ترجمہ و تلخیص: سید راشد بخاری

اسلامی دنیا میں اور اس سے باہر یہ بحث بہت عرصے سے چل رہی ہے کہ اسلام کے ماضی اور مسلمانوں کے حال میں وہ کیا عناصر ہیں جو آزادئ و جمہوریت کے قیام اور ترقی میں مثبت یا منفی کردار ادا کرتے ہیں یا کر سکتے ہیں۔ تاریخی تناظر سے دیکھا جائے تو دنیا کی تمام غیر مغربی تہذیبوں میں سے اسلام میں مغربی طرز کی جمہوریت کے لیے سب سے زیادہ امکانات نظر آتے ہیں۔ تاریخی، ثقافتی اور مذہبی اعتبار سے یہ مغرب کے قریب ترین ہے۔ یہودی رعیسائی اور یونانی رومی ورثے میں، جس نے ہماری جدید تہذیب کی صورت گری میں مدد کی ہے، اسلام بہت سی چیزوں میں اشتراک رکھتا ہے (اگرچہ کسی بھی طرح ہر چیز میں نہیں)۔ تاہم سیاسی حوالے سے دیکھا جائے تو یہ آزادئ و جمہوریت کے لیے بدترین امکانات پیش کرتا ہے۔ بین الاقوامی اسلامی کانفرنس تنظیم کی چھیالیس خودمختار ریاستوں [اب چھپن] میں سے صرف ایک جمہوریہ ترکی کو مغربی اصطلاح میں جمہوریت قرار دیا جا سکتا ہے۔ حتیٰ کہ یہاں بھی آزادی کے راستے میں بہت سی رکاوٹیں حائل ہیں۔ باقی ممالک میں سے کچھ نے تو کبھی جمہوریت کا تجربہ کیا ہی نہیں، کچھ نے تجربہ تو کیا لیکن ناکام ہوئے، چند ایک نے حال ہی میں، اگرچہ اقتدار سے دست برداری کا نہیں، لیکن شراکت اقتدار کا تجربہ کیا ہے۔

کیا ایک ایسے معاشرے میں جو اسلامی اعتقادات اور اصولوں سے متاثر ہے اور جو اسلامی تجربے اور روایت کی بنیادوں پر قائم ہوا ہے، آزادئ و جمہوریت قابلِ عمل ہو سکتی ہے؟ یقیناً بنیادی طور پر بلکہ خالصتاً یہ ذمہ داری مسلمانوں ہی کی ہے کہ وہ اپنے ایمان کے اصل پیغام کی تشریح و توضیح کریں اور یہ فیصلہ کریں کہ اسلامی تاریخ و ثقافت کی چودہ صدیوں کے قیمتی ورثے میں سے کیا کچھ اور کس شکل میں برقرار رکھنا

چاہیے؟ سب مسلمان مذکورہ بالا سوال کا یکساں جواب نہیں دیتے لیکن بہت کچھ ان کے اسی جواب پر منحصر ہے۔

ضعف و ناتوانی کی چبھن

۱۴ دسمبر ۱۹۰۹ء کو عثمانی سلطان محمود پنجم نے عثمانی پارلیمنٹ سے اپنے خطاب میں ''آئینی اور مشاورتی حکومت'' کے لیے اپنی انتظامیہ کی وابستگی اور عزم (commitment) کا اظہار کیا کہ ''یہی راستہ سلامتی اور نجات کا ہے جس کی تائید و تجویز شریعت نے بھی کی ہے اور عقل اور روایت سے بھی ثابت ہوتی ہے''۔ اس خطاب کے مندرجات اور ادائیگی میں ۱۹۰۸ء کے ینگ ترک انقلاب اور ۱۹۰۹ء کی بہار میں انقلاب مخالف بغاوت کو کچلنے کے بعد کی صورت حال کا ادراک واظہار پایا جاتا تھا۔

بحال شدہ آئین کے تحت عثمانی سلطنت آئینی بادشاہت بن چکی تھی اور سلطان کا پارلیمنٹ میں برٹش سٹائل خطاب سلطان کے لیے اس کے وزراء نے لکھا تھا، جن کی پالیسیوں کو اس میں واضح کیا گیا تھا۔ اس میں جو زبان استعمال کی گئی وہ دلچسپ اور قابلِ غور ہے۔ آئین سے مراد ''مشروطیت'' ہے، ایک اصطلاح جو انیسویں صدی میں نئے ضابطہ ہائے کار (procedure) کی تشریح کے لیے وضع ہوئی جبکہ ''مشورت'' ایک پرانی اصطلاح ہے، جو عثمانی سیاسی روزمرہ میں بھی اور اسلامی سیاسی لٹریچر میں بھی کثرت سے استعمال ہوتی ہے۔ اس اصطلاح کے ساتھ جو اسلامی تصور وابستہ ہیں وہ ''مقدس شریعت'' اور ''عقل و نقل'' کے اصولوں سے واضح ہوتے ہیں۔ ''عقل و نقل'' کی اصطلاح مسلمان علمائے دینیات کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔ مغربی اداروں سے اخذ و استفادہ کی خواہش کو مفید خیال کرنا اور انہیں اصل اور مستند اسلامی اصولوں کی طرف واپسی سے تعبیر کرتے ہوئے پیش کرنا انیسویں صدی کے اکثر اور بیسویں صدی کے کچھ اسلامی مصلحین کی پہچان اور خصوصیت ہے۔

اس طرح کی تبدیلی کی خواہش بنیادی طور پر مغربی قوت و امارت اور اس کے مقابلے میں مسلمانوں کی کمزوری اور غربت کے ادراک سے پیدا ہوئی۔ اس سیاسی تبدیلی کو ایک پرفخر اور انتہائی قدامت پرست معاشرے کے افراد کے لیے قابل قبول بنانے کے لیے، جن کی اپنی قدیم اور مضبوط مذہبی سیاسی روایات

موجود ہوں، اسلام کے ماضی سے مثالیں ڈھونڈنے یا ایجاد کرنے کو ضروری خیال کیا گیا۔ ان [روایات] میں ایمان نہ لانے والوں اور ان کے طور طریقوں سے گہری نفرت موجود ہے۔ یہ آسان نہیں کہ ریاستی نظام چلانے جیسے نہایت بنیادی معاملات میں ان لوگوں سے ہدایات لی جائیں جنہیں وہ ایک عرصے تک جاہل اور غیر مہذب شمار کرتے رہے ہیں۔

مسلمانوں میں احساسِ شکست اور کمزوری کا پہلا اہم ترین اظہار ویانا کے دوسرے محاصرے (۱۶۸۳ء) کی ناکامی اور کارلووٹز کے معاہدہ (Treaty of Karlowitz 1699) کے بعد اٹھارہویں صدی کے اوائل میں ہوا۔ اول الذکر ناکامی عثمانی حکومت پر اس کے فاتح دشمن کی طرف سے مسلط کی گئی تھی۔ اس سے قبل بھی مسلمانوں کو شکست اور پسپائی کا سامنا کرنا پڑا تھا، مثلاً ہسپانیہ (سپین) سے مسلمانوں کا حتمی انخلاء، روس میں تاتاری سلطنت کا خاتمہ، جنوب اور جنوب مشرقی ایشیاء کے مسلمان علاقوں پر مغربی یورپی بحری طاقتوں کی بالادستی وغیرہ۔

لیکن یہ تمام ناکامیاں ایک طرح سے باہری اور ثانوی تھیں اور اسلام اور مشرقِ وسطیٰ کے مرکزی حصے پر اس کے اثرات محدود دکھائی دیتے تھے، جہاں آخری اور کئی حوالوں سے اہم ترین مسلمان فوجی سلطنت یعنی سلطنت عثمانیہ، عیسائیت کے خلاف اپنی طویل جدوجہد میں اسلام کی تلوار اور ڈھال کے طور پر اپنا کردار برابر انجام دے رہی تھی۔ کچھ عرصے تک کمزوری کا یہ احساس عثمانیوں کے حکومتی طبقۂ بالا تک محدود رہا۔ یہی طبقہ توازن طاقت کی تبدیلی کا سب سے پہلا شکار تھا۔ جبکہ باقی آبادی کی بیرونی حملے اور حقائق دونوں سے عثمانی ریاست کی فوجی طاقت بدستور حفاظت کر رہی تھی، جو اپنے زوال میں بھی ایک عظیم فوجی قوت تھی۔

اسی طرح بحث کی شرائط فوجی معاملات یعنی ہتھیاروں، تربیت اور فوجی تنظیم تک ہی محدود تھیں کیونکہ کچھ عرصہ تک یہی وہ میدان تھا جہاں مسلمانوں نے مغرب کی بڑھتی ہوئی بالادستی کا تجربہ کیا تھا۔ اٹھارہویں صدی کے اواخر کے واقعات ـــ بحر اسود میں روسیوں اور مصر میں فرانسیسیوں ـــ نے یورپی بالادستی کو تکلیف دہ حد تک واضح کر دیا تھا۔ شکستوں کا یہ تسلسل مذہبی معاشرے کے ان لوگوں کے لیے بے حد تشویش ناک تھا جو سیاسی اور فوجی کامیابیوں کی ایک طویل تاریخ رکھتے تھے۔ جن کی یہ کامیابیاں ان

کے مذہب کے بانی کی زندگی میں ہی شروع ہوگئیں تھیں اور جو اپنی اس مقدس تاریخ کا پرفخر احساس بھی رکھتے تھے۔

اس وقت مصلحین میں سے چند ایسے لوگ اٹھے جنہوں نے یہ دلیل دی کہ یورپی فوجی بالادستی کی وجوہات غیر فوجی ہیں اور ان میں دو وجوہات پہلی معاشی اور دوسری سیاسی زیادہ اہم ہیں۔ کچھ نے مغربی طاقت کے ان دو ذرائع یعنی صنعت سازی اور آئینی حکومت کی طرف زیادہ خصوصیت سے اشارہ کیا۔

اسرائیل کے خلاف خصوصاً ۱۹۴۸ء اور ۱۹۶۷ء کی جنگوں میں عربوں کی ناکامی نے اس عظیم بحث کو دوبارہ زندہ کر دیا کہ آخر عربوں کے ساتھ، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر مسلم معاشرے میں خرابی کیا ہے اور اسے دور کرنے کے لیے کیا کچھ کیا جاسکتا ہے۔ ویانا پر قبضے میں ناکامی پر جس طرح ترکوں نے سوچا تھا اسی طرح یروشلم پر قبضہ کرنے میں ناکام ہو کر عربوں نے سوچا کہ اصل میں یہ عسکری کمزوری ہے اور اس کا حل بھی عسکری قوت میں اضافے سے ہی ہوسکتا ہے یعنی بڑی اور بہتر فوجیں اور بڑے اور بہتر ہتھیار۔ لیکن جب یہ بڑی اور بہتر فوجیں بھی ناکام ہوگئیں تو اس بات پر زیادہ آمادگی نظر آئی کہ ان لوگوں کی بات پر بھی توجہ دی جائے جو ان ناکامیوں کی زیادہ گہری وجوہات اور زیادہ بنیادی حل پیش کر رہے ہیں۔

بنیاد پرست اور جمہوریت پسند

بہت سے ایسے افراد ہیں جو کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں کرتے اور موجودہ نظاموں کو تھوڑی سی بہتری کے ساتھ برقرار رکھنے کو ہی ترجیح دیتے ہیں، خواہ یہ انتہا پسند آمریت ہو یا شخصی حکومت۔ چیزوں کو جوں کا توں رکھنے کو ترجیح دینے والوں میں یا تو وہ لوگ ہیں جو موجودہ نظام میں اقتدار کے منصب پر ہیں یا وہ جو کسی اور طرح اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ان میں وہ غیر ملکی طاقتیں بھی شامل ہیں جن کے اگر اپنے مفادات محفوظ ہوں تو وہ ان موجودہ مملکتوں کو تسلیم کرنے اور ان کی مدد و حمایت کرنے پر آمادہ رہتی ہیں۔ لیکن ایسے بھی ہیں جو موجودہ نظاموں کو برائی بھی سمجھتے ہیں اور تباہی اور بدقسمتی بھی۔ ان کی خواہش ہے کہ نئے ادارے لازماً بنانے اور قائم کرنے چاہییں۔

بنیادی تبدیلی کے حامیوں کو دو بڑے گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ اسلامی بنیاد پرست اور

جمہوریت پسند ــــ ہر گروہ کے اپنے وسیع النوع اور بعض اوقات باہم متصادم نظریات ہیں۔

بنیاد پرستی کی اصطلاح پروٹسٹنٹ عیسائیوں کے کتابی سلسلوں سے اخذ کی گئی ہے۔ ''بنیاد پرست'' نامی کتاب امریکہ میں ۱۹۱۰ء کے قریب شائع ہوئی تھی۔ یہ اصطلاح پہلے پہل امریکہ میں ان مخصوص گروہوں کے لیے استعمال کی گئی تھی جو آزاد رُو الٰہیات (liberal theology) اور بائبلی تنقید کو مسترد کر کے مرکزی چرچوں سے منحرف ہو گئے تھے اور جو بائبلی متن کے خطا ناپذیر ہونے اور مقدس متن کے لغوی یا لفظی مفہوم پر اصرار کرتے تھے۔ چنانچہ مسلم تحریکات کو اس اصطلاح سے موسوم کرنا نہ صرف ایک کمزور تمثیل ہے بلکہ یہ گمراہ کن بھی ہو سکتی ہے۔

اصلاحی الٰہیات (reformist theology) مسلمانوں کے درمیان ماضی میں ایک متنازع مسئلہ ضرور رہا ہے لیکن اب نہیں ہے اور یہ ان لوگوں کی بنیادی دلچسپیوں سے بہت دُور ہے جنہیں مسلم بنیاد پرست کہا جاتا ہے۔ ان کی دلچسپیاں کتابِ مقدس اور مذہبیات سے زیادہ معاشرے، قانون اور حکومت سے ہیں۔

مسلم بنیاد پرستوں کے خیال میں غیر ملکی 'کافر' اور مسلمان 'مرتد' اسلامی امت کو خرابی کی طرف لے گئے ہیں۔ ان میں سے بھی موخرالذکر زیادہ خطرناک اور تباہ کن ہیں۔ ان کی راہنمائی یا جبر کے تحت مسلمانوں نے اپنے دین کے اصول و قوانین ترک کر دیے ہیں اور ان کے بجائے سیکولر (جس سے ان کی مراد ''لادین'' ہے) قوانین اور اقدار اپنا لیے ہیں۔ تمام غیر ملکی نظریات ــــ لبرلزم، سوشلزم، حتیٰ کہ نیشنلزم بھی ــــ جو مسلمان کو مسلمان کے خلاف کھڑا کر دیں، برائی ہیں۔ اور مسلم دنیا آج خدا کے دیے ہوئے قوانین سے پہلوتہی کرنے کا ہی خمیازہ بھگت رہی ہے، جو اسے ازراہِ عنایت خدا کی طرف سے بخشے گئے تھے۔

اس سب کا حل ہے جہاد کے قدیم مسلم فرض کی ادائیگی: پہلے اپنے مرتد مسلمان حکمرانوں سے جنگ اور پھر انہیں نکال باہر پھینکنے کے بعد دنیا میں اسلام کے عظیم کردار کو دوبارہ زندہ کرنے کے لیے معاشرے کو اسلامی بنانا۔ اپنی جڑوں اور استناد کی طرف واپسی ہمیشہ پرکشش ہوتی ہے۔ ان لوگوں کے لیے اس کی اثر انگیزی دوگنا ہو جاتی ہے جو روزانہ اپنے سر منڈھی ہوئی ناکام بدیسی جدتوں کے نتائج بھگتتے ہیں۔

اسلامی بنیاد پرستوں کے نزدیک جمہوریت واضح طور پر ایک غیر متعلق (خارج از بحث) نظریہ ہے۔ مطلق العنان کمیونسٹوں کے برعکس وہ اس کا صحیح یا غلط، استعمال ہی کم کرتے ہیں۔ تاہم وہ ان تمام مواقع کو ضرور استعمال کرنا اور ان کا مطالبہ کرنا چاہتے ہیں جو ایک جمہوری نظام خود اپنی ہی منطق کے تحت انہیں مہیا کرتا ہے۔ لیکن اس موقع پر وہ جمہوری سیاسی طریقہ کار سے نہ اپنی نفرت چھپاتے ہیں اور نہ ہی اپنا یہ ارادہ پوشیدہ رکھتے ہیں کہ اگر وہ اقتدار میں آئے تو اسلامی قوانین کے مطابق ہی حکومت چلائیں گے۔ جمہوری انتخابات کے بارے میں ان کے رویے کو ایک جملے میں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے: ایک فرد، ایک ووٹ، ایک بار۔

لیکن یہ بھی مکمل سچائی نہیں ہے۔ کم از کم ایرانیوں کی حد تک نہیں۔ ایران میں دیگر مسلم ممالک کے مقابلے میں انتخابات کے دوران پریس میں اور پارلیمنٹ میں بحث وتنقید کی زیادہ آزادی دی جاتی ہے۔ لیکن وہاں اس چیز پر سخت پابندیاں اور حدیں مقرر ہیں کہ امیدوار کون ہو، کیا گروپس یا جماعتیں بنائی جا سکتی ہیں، اور کن خیالات کا اظہار کیا جاسکتا ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اسلامی انقلاب اور جمہوریہ کے بنیادی اصولوں کے بارے میں کسی سوال کی گنجائش نہیں۔

وہ لوگ جو عرب اور دیگر اسلامی دنیا میں جمہوری اصلاحات کے لیے جدوجہد کرتے ہیں یا اس کے لیے دلائل دیتے ہیں ان کا دعویٰ ہے کہ وہ اپنے ناکام پیش رووں کے مقابلے میں زیادہ موثر اور زیادہ درست جمہوریت کی نمائندگی کرتے ہیں، ایسی جمہوریت جسے نہ تو کسی اسم صفت کے اضافے سے مسخ کر دیا گیا ہے، نہ مذہبی یا نظریاتی شرائط کے تابع کیا گیا ہے اور نہ جسے کسی علاقائی یا فرقہ وارانہ مفادات کی بھینٹ چڑھایا گیا ہے۔

جزوی طور پر ان کی یہ تحریک اس جمہوری تبدیلی کی لہر کی مشرقِ وسطیٰ تک توسیع ہے جو جنوبی یورپ اور لاطینی امریکہ کے کئی ممالک میں پہلے ہی انتقال اقتدار کا باعث بن چکی ہے۔ ایک حد تک یہ سوویت یونین کی ٹوٹ پھوٹ اور سرد جنگ میں جمہوری بالادستی کی کامیابی کا ردعمل ہے۔ یہ بڑی حد تک اسلامی ممالک میں امریکی جمہوریت اور امریکی مقبول ثقافت کے بڑھتے ہوئے اثرات کا بھی نتیجہ ہے۔

کچھ عرصہ تک امریکہ کو مغربی یورپ ہی کی ایک توسیع سمجھا جاتا رہا۔ جو ایک ہی تہذیب کا حصہ

ہیں، جہاں عظیم سلطنتوں کے طور پر ایک ہی زبان بولی جاتی ہے، ایک ہی مذہب ہے، اور وہ ایک ہی طرح کی مہلک خرابیوں میں مبتلا ہیں۔ لیکن قریب سے دیکھیں تو امریکی اور مغربی یورپی جمہوریت میں گہرے تضادات ظاہر ہوئے ہیں۔ ان تضادات نے اول الذکر کو ایسی کشش بخش دی ہے جو ثانی الذکر کو کبھی حاصل نہیں رہی۔

سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ امریکہ نے کبھی عرب علاقوں پر استعماری طاقت استعمال نہیں کی۔ اس کا نتیجہ اگرچہ زیادہ واضح نہیں لیکن آگے جا کر ایک کہیں زیادہ اہم فرق ظاہر ہوتا ہے۔ امریکیوں نے عمومی طور پر -- اگرچہ کچھ جانے بوجھے استثناء موجود ہیں۔ — استعماری رویہ اختیار نہیں کیا — وہی رویہ جس نے ایک طرف برطانویوں اور فرانسیسیوں اور دوسری طرف ان کے مقبوضہ علاقے کے لوگوں کے درمیان انسانی تعلقات کو متاثر کیا ہے اور ایک حد تک ابھی بھی کر رہا ہے — اسی سے امریکیوں کے لیے مشرقِ وسطیٰ کے لوگوں کے ساتھ ایک طرح کے غیر رسمی، مساویانہ اور فرد سے فرد کی سطح پر تعلقات قائم کرنا ممکن ہوا ہے۔ جو ابھی تک یورپیوں کے لیے مشکل سے ہی ممکن ہے۔

مشرقِ وسطیٰ کے معاشرے میں امریکی مقبول ثقافت اور طور طریقوں نے برطانیہ اور فرانس کی اشرافیہ ثقافت کے مقابلے میں کہیں زیادہ تیزی اور وسعت کے ساتھ نفوذ کیا ہے۔ اس طرح کے تعلقات کو مزید تقویت مغرب کی طرف ہجرت سے بھی ملی ہے۔ اس وقت لاکھوں کی تعداد میں جنوبی ایشیا اور شمالی افریقہ سے تعلق رکھنے والے برطانوی اور فرانسیسی شہری ہیں۔ لیکن انہیں معاشرے میں انضمام اور قبولیت کی وہ سطح حاصل کرنے میں شائد ابھی کافی عرصہ لگے جو مشرقِ وسطیٰ سے تعلق رکھنے والے نئے امریکیوں کو حاصل ہے۔ یہ لوگ امریکہ کے سیاسی عمل کا ایک اہم حصہ بن چکے ہیں، لیکن انہیں اپنے اپنے وطن مولود کے سیاسی عمل میں ابھی اپنا کردار ڈھونڈنا ہے۔

بلاکم و کاست یہ امریکی ثقافت کی وسیع المشربی، انجذابی قوت اور کشش ہے جس نے اسے خالص اور مستند اسلام کے بزعم خود محافظین کے لیے خوف اور نفرت کا نشانہ بنا دیا ہے۔ یہ ان کی قدیم اقدار کے لیے پہلے سے کہیں بڑا خطرہ ہے۔ وہ اقدار جو انہیں عزیز ہیں اور وہ قوت اور اثر و نفوذ جو ان اقدار سے انہیں حاصل ہوتا ہے۔

قرآن کی آخری سورۃ میں، جس کا بہت کثرت سے حوالہ دیا جاتا ہے، ایمان لانے والے پر زور دیا گیا ہے کہ وہ خدا کی پناہ میں آ جائے ''اس وسوسہ ڈالنے والے کے شر سے، جو بار بار پلٹ کر آتا ہے، جو لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے''۔ قرآن میں شیطان دشمن ہے، دھوکہ باز ہے، سب سے بڑھ کر بھڑکانے والا اور نفرت پھیلانے والا ہے، جو انسانوں کو دین حق سے بھٹکاتا ہے۔ یقیناً انہی معانی میں آیت اللہ خمینی نے امریکہ کو شیطان عظیم قرار دیا تھا۔ شیطان جو دشمن ہے، بلکہ خاص طور پر اور اس کے عوام کے لیے یقیناً قابل اعتبار حد تک ـــ ترغیب وتحریص کا ایک ذریعہ ہے۔

عدم اطمینان، مایوسی، غصے اور اکتاہٹ کے اس دور میں، نیشنلزم اور سوشلزم اور نیشنل سوشلزم ـــ جو انیسویں صدی یورپ کا تحفہ ہیں ـــ کی پرانی کشش ختم ہو چکی ہے۔ آج صرف جمہوریت پسند اور اسلامی بنیاد پرست ہی ذاتی اور علاقائی وفاداریوں کی سطح سے بلند ہو کر اپنی طرف متوجہ کر رہے ہیں۔ دونوں نے جزوی طور پر موجودہ حکومتوں میں نفوذ کر کے، کچھ محدود کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ اور ایسا زیادہ تر ان حکومتوں پر دباؤ ڈال کر کیا گیا ہے تاکہ وہ انہیں کچھ حصہ اور رعائتیں دیں۔

زیادہ تر یہ کامیابیاں روایتی آمرانہ حکومتوں تک ہی محدود رہی ہیں، جنہوں نے جمہوریت پسندوں یا بنیاد پرستوں یا دونوں کو کچھ علامتی مثبت اشارے دیے ہیں۔ حتیٰ کہ انتہا پسند آمریتوں نے اکثر آزادرُو جمہوریت کے ساتھ کسی سمجھوتے کا اعتراف نہ کرتے ہوئے، اپنے مشکل وقت میں اسلامی جذبات کو مطمئن کرنے بلکہ استعمال کرنے کی کوششیں کی ہیں۔

اسلامی دنیا میں جمہوریت کی بحث کا مرکز ایک چبھتا ہوا سوال ہے: کیا آزاد جمہوریت اسلام کے ساتھ بنیادی طور پر مطابقت رکھتی ہے یا یہ (محض) قانون کا کچھ احترام ہے، تنقید کی کچھ برداشت ہے (یعنی) بہت کچھ وہ جس کی توقع شخصی حکومتوں سے بھی کی جا سکتی ہے؟ جمہوری دنیا میں حکومت کی کئی مختلف شکلیں ہیں۔ جمہوریائیں اور بادشاہتیں، صدارتی اور پارلیمانی طرز ہائے حکومت، سیکولر ریاستیں اور چرچ اور انتخابی نظاموں کا ایک وسیع سلسلہ ہے۔ لیکن ان سب میں کچھ ایسے بنیادی مفروضے اور اعمال مشترک ہیں جو جمہوری اور غیر جمہوری حکومتوں میں فرق واضح کرتے ہیں۔ کیا اسلامی دنیا کے لیے بھی یہ ممکن ہے کہ وہ حکومت کی کوئی ایسی شکل اختیار کر سکیں جو ان کی اپنی تاریخی، ثقافتی اور مذہبی روایات سے بھی ہم

آہنگ ہو اور جو اپنے عوام کو شخصی آزادی اور انسانی حقوق بھی ان معنوں میں عطا کر سکے جن معنوں میں ان اصطلاحات کو مغرب کے آزاد معاشروں میں سمجھا جاتا ہے؟

کوئی بھی یہ نہیں سمجھتا خاص طور پر اسلامی بنیاد پرست کہ ان کا عقیدہ اور سیاسی پروگرام آزادرُو جمہوریت سے مطابقت رکھتا ہے۔ لیکن اسلامی بنیاد پرستی بہت سی روؤں میں سے ایک رو ہے۔ پیغمبر [صلی اللہ علیہ وسلم] کے مشن کے بعد چودہ صدیوں میں ایسی بہت سی تحریکیں گزری ہیں۔ انتہا پسند، عدم رواداری، جارح اور متشدد۔ ان کی قیادت کرشماتی مذہبی شخصیتوں کے پاس رہی۔ انہوں نے عام طور پر اپنے وقت کے مسلم حکمرانوں کو دین سے انحراف اور معاشرے کے بگاڑ کا ذمہ دار قرار دیتے ہوئے اپنی جدوجہد کا آغاز کیا۔ کبھی ان تحریکات کو حکمرانوں نے سختی سے کچل دیا اور کبھی یہ تحریکیں طاقت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئیں جسے انہوں نے پہلے اپنے گھر میں، اپنے نزدیک دین کے دشمنوں کو اور مرتدوں اور منحرف مسلمانوں کو ختم کرنے کے لیے استعمال کیا اور پھر دین حق کے بیرونی دشمنوں کے خلاف جہاد کیا۔ وقت آنے پر ان حکومتوں کو بھی یا تو ختم کر دیا گیا یا اگر وہ قائم بھی رہیں تو ــــ عام طور پر مختصر عرصے کے لیے ــــ ان حکومتوں کے مقابلے میں، جنہیں انہوں نے ختم کیا تھا، زیادہ بہتر نہیں بلکہ بعض حوالوں سے بدترین حکومتیں بن کر رہ گئیں۔ اسلامی جمہوریہ ایران میں بھی کچھ اسی طرح ہوتا نظر آ رہا ہے۔

چنانچہ سوال یہ نہیں کہ آیا آزادرُو جمہوریت اسلامی بنیاد پرستی کے ساتھ مطابقت رکھتی ہے یا نہیں ــــ صریحاً ان دونوں میں کوئی مطابقت نہیں ــــ بلکہ سوال یہ ہے کہ کیا خود اسلام کے ساتھ یہ ہم آہنگ ہے یا نہیں؟ آزادرُو جمہوریت، خواہ کہیں تک بھی پھیل جائے، خواہ کتنا ہی اس کو تبدیل کر دیا جائے، اپنی اصل میں مغرب کی پیداوار ہے۔ جسے ہزار سالہ یورپی تاریخ نے ایک شکل دی ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یورپ کے دوہرے ورثے: یہودی و عیسائی مذہب اور اس کی اخلاقیات اور یونانی و رومی حکومتی نظام اور قانون نے اسے متشکل کیا ہے۔ کوئی ایسا نظام کسی اور ثقافتی روایت میں پیدا نہیں ہوا۔ یہ دیکھنا ابھی باقی ہے کہ کیا یہ نظام کسی اور تہذیب و ثقافت میں بھی پنپ سکتا ہے کہ نہیں؟

اس مناظرانہ اور معذرت خواہانہ بحث کو علیحدہ رکھتے ہوئے کہ ''مغربی آزادروی (liberalism) نہیں بلکہ اسلام ہی اصل جمہوریت ہے'' یا یہ کہ ''مغربی آزادروی اسلامی بنیادوں سے ہی نکلی ہے'' ــــ

اسلام اور آزاد رو جمہوریت کی بحث چند اہم نکات پر مشتمل ہے۔

خدائی طرزِ حکومت (God's Polity)

ہر تہذیب اچھی حکومت کا اپنا ایک تصور اختیار کرتی ہے اور پھر اس تصور کو عملی شکل دینے کے لیے کچھ ادارے تشکیل دیتی ہے۔ کلاسیکی عہد قدیم سے مغرب میں یہ ادارے عام طور پر کسی اسمبلی یا کونسل کی شکل میں بنتے تھے جن میں حکومتی نظم ونسق کے ماہر اراکین حکومت بنانے، چلانے یا بعض مواقع پر تبدیل کرنے کے لیے شرکت کرتے تھے۔ اس نظام سیاست کی مختلف تعریفیں ہوسکتی ہیں اس لیے اس ریاستی معاشرے میں سے حکومت چلانے کے ذمہ دار رکن کی اہلیتیں بھی مختلف ہوسکتی ہیں۔

اس میں بعض اوقات، جیسے قدیم یونانی شہر میں، شہریوں کی براہ راست شرکت بھی ہوسکتی ہے۔ اکثر اوقات اس عمل میں اپنی مخصوص اہلیتوں کی بنا پر شرکت کرنے والے ایک متفق اور مکرر الوقوع طریقہ کار کے تحت خود اپنے [حلقے] میں سے ہی اپنی نمائندگی کے لیے کسی کو منتخب کرتے تھے۔ ان اسمبلیوں کی کئی اقسام تھیں، جن کے افعال بھی اور انتخاب کنندگان (electorates) بھی مختلف ہوسکتے تھے اور اکثر جن کا فیصلہ سازی، قانون اور ٹیکسوں کے نفاذ میں کردار ہوتا تھا۔

ان اداروں کی کارکردگی اور افعال کو رومی قانون کے اصولوں کے ذریعے موثر بنایا گیا اور ''قانونی فرد'' کے اس نظام کے ذریعے جو رومی قانون نے پیدا کیا۔ ''قانونی فرد سے مراد وہ ادارہ یا تنظیم ہے جسے قانونی مقاصد کے لیے ایک فرد کے طور پر سمجھا جاتا تھا، جو جائیداد کی ملکیت رکھنے، خریدنے، فروخت کرنے، معاہدے کرنے اور ذمہ داریاں اختیار کرنے اور شہری اور تعزیری مقدمات میں بطور مدعی یا مدعا علیہ پیش ہونے کی اہلیت رکھتا تھا''۔

اس بات کی علامات موجود ہیں کہ ایسے ادارے قبل از اسلام عرب میں بھی موجود رہے ہیں۔ اسلام کی آمد کے ساتھ ہی یہ ادارے غائب ہوگئے اور پیغمبر [صلی اللہ علیہ وسلم] کے وقت سے لے کر اس وقت تک جب اسلامی دنیا میں پہلی بار مغربی ادارے متعارف ہوئے، مسلم دنیا میں یونانی ''باؤل'' (boule)، رومی ''سینیٹ''، یہودی ''سن ہیڈرن'' (sanhedrin)، آئیس لینڈ کی آلتھنگ (Althing) یا اینگلو

سیکسن ''وائٹنگ موٹ'' (witenagemot) یا اس طرح کے یورپی عیسائی اداروں، مجلسوں، کونسلوں، پارلیمنٹوں یا اسمبلیوں کا کوئی متبادل موجود نہیں تھا۔

ایسے اداروں کی تشکیل میں ایک رکاوٹ ان (corporate persons) کی قانونی شناخت (legal recognition) نہ ہونا تھا۔ اس قانونی شناخت کے حصول کے لیے چند محدود کوششیں کی گئیں۔ اسلامی تجارتی قانون محدود کاروباری مقاصد کے لیے شراکت داریوں کی مختلف شکلوں کو تسلیم کرتا ہے۔ ''وقف'' ایک ایسا نیک نام ادارہ ہے، جو ایک بار قائم ہونے کے بعد اپنے بانی سے آزادانہ طور پر، جائیداد رکھنے، اس کے انتقال وخرید وفروخت کا اختیار حاصل کر لیتا ہے۔ لیکن یہ اپنے ان اصل مقاصد سے آگے کبھی نہیں بڑھے اور کہیں بھی مغرب کے حکومتی کلیسائی یا پرائیویٹ کارپوریٹ اداروں سے مماثلت تک نہیں پہنچے۔

چنانچہ مسلم حکومت ہر زاویے سے اپنا ایک مخصوص کردار رکھتی ہے۔ اصولی طور پر یہاں کوئی ریاست نہیں ہے لیکن حکمران ہے، عدالت نہیں ہے لیکن منصف ہے۔ حتیٰ کہ طے شدہ اختیارات، حدود اور افعال کے ساتھ کوئی ''شہر'' بھی نہیں ہے صرف کچھ پڑوسیوں کا اجتماع ہے جو اکثر اپنی خاندانی، قبائلی، نسلی، یا مذہبی پہچان سے ممیز ہوتے ہیں۔ اور جن پر عام طور سے حکمران کے نافذ کردہ فوجی افسران حکومت کرتے ہیں۔ بلکہ مشہور عثمانی شاہی دیوان ـــ دیوان ہمایوں ـــ جسے یہاں کا دورہ کرنے والے کئی مغربی افراد 'کونسل' قرار دیتے ہیں، کو بھی زیادہ درست طور پر ایک میٹنگ ہی کہا جا سکتا ہے۔ اعلیٰ سیاسی، انتظامی، عدالتی، مالیاتی اور فوجی افسران وعہدے داران کی یہ میٹنگ ابتداء میں سلطان کی زیر صدارت اور بعد ازاں وزیر اعظم کی زیر صدارت ہفتے کے مخصوص دنوں میں منعقد ہوتی تھی۔ اس میں پیش کردہ معاملات پر دیوان کے متعلقہ ارکان سفارشات پیش کرتے تھے۔ حتمی ذمہ داری اور فیصلہ سلطان یا وزیر اعظم ہی کا ہوتا تھا۔

مغرب میں ایسے اداروں کا اہم کام قانون سازی تھا، جس پر رواں صدیوں کے ساتھ ساتھ یہ ذمہ داری بڑھتی رہی۔ مسلم عقیدے کے مطابق اسلامی ریاست میں قانون سازی کا عمل موجود نہیں ہے۔ چنانچہ کسی قانون ساز ادارے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔

اصولی طور پر اسلامی ریاست ایک مذہبی ریاست (تھیوکریسی) ہے۔ تھیوکریسی بھی مغربی معنوں میں نہیں جہاں چرچ اور پادریوں کی حکومت ہوتی تھی کیونکہ اسلامی دنیا میں ان کا وجود نہیں، بلکہ زیادہ لغوی مفہوم میں اس سے مراد خدا کی حکمرانی ہے۔ مسلمانوں کے نزدیک جائز اختیارات صرف خدا ہی کی طرف سے ملتے ہیں، اور حکمران اپنے اختیارات اور قوت عوام سے یا اپنے آباء واجداد سے نہیں بلکہ خدا اور اس کے مقدس قانون سے حاصل کرتے ہیں۔ عملاً ان عقائد کے برعکس شاہی جانشینی کا قاعدہ مسلّم ہو گیا لیکن اسے کبھی مقدس قانون کی توثیق حاصل نہیں ہوئی۔

حکمرانوں کے بنائے گئے قوانین کو نظری سطح پر واحد مستند قانون، یعنی خدا کے قانون کی، جو وحی کے ذریعے حاصل ہوا تھا، تعبیر و توضیح قرار دیا گیا۔ اصولی طور پر ریاست خدا کی ریاست تھی، خدا کے بندوں پر خدا کی حکومت تھی، قانون خدا کا قانون تھا، فوج خدا کی فوج تھی اور دشمن بھی یقیناً خدا کا دشمن تھا۔

قانون سازی کے یا کسی بھی طرح کے ایسے اداروں کے بغیر، نمائندگی کے کسی اصول کی یا نمائندگان منتخب کرنے کے کسی طریقہ کار کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ یہاں اجتماعی فیصلے کا کوئی موقع نہیں تھا، چنانچہ اتفاق رائے کے سوا، ایسا کوئی فیصلہ حاصل کرنے اور اس کا اظہار کرنے کے طریقہ کار کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ مغربی سیاسی ارتقاء میں جو امور مرکزی اہمیت رکھتے ہیں مثلاً انتخابات کا انعقاد اور شراکتی حکومت کی تعریف اور وسعت، ان امور کی کوئی گنجائش اسلامی سیاسی ارتقاء میں نہیں ہے۔

ان اختلافات کے پیش نظر، یہ امر تعجب خیز نہیں کہ اسلامی ریاستوں کی تاریخ ایک تقریباً مستقل مطلق العنانیت کی تاریخ ہے۔ مسلم عوام جائز مسلم حکمران کی اطاعت اپنا مذہبی فرض سمجھ کر کرتے ہیں۔ مطلب یہ کہ نافرمانی گناہ بھی تھا اور جرم بھی۔

انیسویں صدی اور پھر مزید بیسویں صدی میں جدیدیت (modernization) نے بھی اس مطلق العنانیت میں کمی کرنے کی بجائے اس میں خاطر خواہ اضافہ ہی کیا۔ جدید ٹیکنالوجی، ابلاغ و ترسیل اور ہتھیاروں نے جہاں ایک طرف حکمرانوں کی بقاء، ان کے جبر و استبداد اور اپنے نظریات و عقائد کی زبردستی تلقین کرنے کی صلاحیت میں اضافہ کیا وہاں سماجی اور معاشی جدت نے ان مذہبی بندشوں اور وسطی قوتوں کو کمزور کر دیا جو مختلف طریقوں سے ان مطلق العنان حکومتوں پر ایک روک لگاتی تھیں۔ ماضی کے

کسی عرب خلیفہ یا ترک سلطان کو کبھی [بہرحال] وہ من مانی اور مطلق قوت و اختیار حاصل نہیں ہوا جو آج کے چھوٹے سے چھوٹے آمروں کو [ٹکنالوجی کی جدتوں کی وجہ سے] حاصل ہو گئے ہیں۔

دو ترغیبات

شائد یہ کہا جائے ـــ اور کہا جاتا ہے ـــ کہ یہ قانونی اور مذہبی اصول کوئی خاص موثر نہیں رہے۔ انتخابی اور معاہداتی اقتدار کا نظریہ خلافت کی ابتداء سے ہی نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ قانون کی بالادستی کا اصول پس پشت ڈالا جاتا رہا ہے۔ کثرتیت اور تنوع کی برداشت، بڑھتی ہوئی مذہبی، نسلی اور سماجی منافرتوں میں کم یا ختم ہو کر رہ گئی ہے۔ مشاورت، اگر کبھی رہی بھی ہے تو حکمران اور اس کے اندرونی حلقے کے درمیان ہی محدود رہی ہے، جبکہ [فرد کے] ذاتی وقار کو جابر حکمران بے مایہ کرتے رہے ہیں جن کے نزدیک اپنے مخالفین کو صرف مار دینا ہی کافی نہیں بلکہ انہیں تشدد کا نشانہ بنانا اور ذلیل و خوار کر کے رکھ دینا بھی ضروری ہے۔

لیکن ان سب مشکلات اور رکاوٹوں کے باوجود جمہوری مقصود کو خطے میں مسلسل قوت مل رہی ہے اور ان عربوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے جو اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہی ان کے معاشی، سماجی اور سیاسی مسائل کا بہترین اور شائد واحد حل ہے۔

ہم جمہوری دنیا میں رہنے والے اسلامی مشرقِ وسطیٰ میں جمہوریت کی ترقی اور حوصلہ افزائی کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟ اور ہمیں اسے تباہی و بربادی سے بچانے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟

دو ترغیبات ایسی ہیں کہ مغربی حکومتیں اکثر ان کا شکار ہو جاتی ہیں اور نتائج خراب نکلتے ہیں۔ پہلی ترغیب یہ ہے کہ اگر بری سے بری آمریت بھی ہماری ضروریات سے مطابقت رکھتی ہے اور جب تک اس کی پالیسیوں سے ہمارے قومی مفادات کا تحفظ نظر آئے تو اسے خوش دلی سے قبول کر لیا جائے۔ مغرب کی عظیم جمہوریتوں کے [مسلم دنیا کے] مطلق العنان اور آمر حکمرانوں کے ساتھ خوشگوار تعلقات سے اور محض تماشائی بنے رہنے سے ان ملکوں میں حکومت مخالف جمہوری جماعتوں [حزبِ اختلاف] کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے اور وہ کمزور ہو جاتی ہیں۔

زیادہ خطرناک ترغیب یہ ہے کہ مسلم ممالک پر حقوقِ انسانی اور اس سے متعلقہ مسائل کے حوالے سے دباؤ ڈالا جائے۔ چونکہ بے رحم آمریتوں پر ایسے دباؤ بے اثر ثابت ہوتے ہیں اس لیے ان اچھے ارادے سے کی گئی مداخلتوں کے نتائج زیادہ معتدل شخصی حکومتوں کو بھگتنا پڑتے ہیں جو اکثر اصلاحات کے مرحلے میں ہوتی ہیں، اگرچہ ان کی رفتار ان کے اپنے حالات اور ضروریات کی مناسبت سے ہوتی ہے۔ قبل از وقت جمہوری عمل کے لیے دباؤ ایسی حکومتوں کو خطرناک حد تک کمزور کر دیتا ہے اور ان کی برخواستگی کا سبب بن جاتا ہے۔ ان کی جگہ جمہوری حزب اختلاف نہیں لیتی بلکہ دیگر قوتیں زیادہ مضبوط اور زیادہ متشدد آمریتوں کے قیام کے لیے آگے آجاتی ہیں۔

خلاصۂ کلام

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اگر ان مسائل کو دیکھا جائے جو مشرقِ وسطیٰ کے ممالک کو ورثے میں ملے ہیں اور جن مشکلات کا انہیں سامنا کرنا پڑتا ہے تو ان ممالک میں جمہوریت کے لیے امکانات اچھے نہیں۔ لیکن یہ امکانات گزشتہ ادوار کے مقابلے میں بہتر ہیں۔ اکثر ممالک کو گہرے معاشی مسائل کا سامنا ہے۔ اگر وہ ان مشکلات پر قابو پانے میں ناکام ہو گئے تب موجودہ آمریتوں اور مطلق العنان حکومتوں کا باقی رہنا مشکل ہے اور ان کی جگہ ایک یا دوسری طرح کے اسلامی بنیاد پرست لے لیں گے۔

ایک سے زیادہ ممالک میں یہ دیکھا گیا ہے کہ بنیاد پرستوں کو مقبولیت ملی ہے کیونکہ وہ اقتدار سے باہر ہیں اور انہیں موجودہ مسائل کا ذمہ دار قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اگر انہوں نے اقتدار حاصل کر لیا اور اس کے ساتھ ذمہ داری بھی قبول کر لی تو وہ جلد ہی اپنی مقبولیت کھو دیں گے۔ لیکن اس کی ان کے نزدیک اہمیت نہیں کیونکہ اگر ایک بار انہیں اقتدار مل گیا تو انہیں وہاں رہنے کے لیے مقبولیت کی ضرورت نہیں رہے گی اور وہ اپنی حکمرانی جاری رکھیں گے۔ کچھ تیل کے محاصل کے ساتھ اور کچھ ان محاصل کے بغیر تاکہ اپنے طریقہ کار کے معاشی نتائج کو مدھم کیا جا سکے۔ ایک وقت آئے گا کہ یہ بنیاد پرست حکومتیں بھی، قوت پر اپنی تمام تر گرفت کے باوجود، تبدیل یا ختم ہو جائیں گی لیکن اس وقت تک وہ آزادی کے مقصد کو شدید اور شائد ناقابل تلافی نقصان پہنچا چکے ہوں گے۔

لیکن ضروری نہیں کہ انہیں لازماً کامیابی حاصل ہو۔ ہمیشہ یہ امکان موجود ہے کہ جمہوریت پسند حکومت بنالیں یا حکومتیں جمہوریت سیکھ جائیں۔ آزادی کی بڑھتی ہوئی خواہش اور اس کا مطلب سمجھنے کی کوشش امید افزاء علامتیں ہیں، اب جبکہ سرد جنگ ختم ہوگئی ہے اور مشرقِ وسطیٰ قوت کے بلاکوں کا میدانِ جنگ نہیں رہا، یہاں کے لوگوں کے لیے یہ موقع ہے — اگر وہ اس سے فائدہ اٹھا سکیں — کہ اپنے فیصلے خود کریں اور اپنے حل خود تلاش کریں۔ کسی اور کے پاس نہ تو یہ اہلیت ہوگی اور نہ ہی یہ خواہش کہ وہ ان کے لیے یہ سب کچھ کرے۔ آج — تاریخ میں پہلی مرتبہ — وہ خود اپنی مرضی کے مالک ہیں۔

[Bernard Lewis, "Islam and Liberal Democracy", *The Atlantic Monthly*, Feb. 1993]